

ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں  
ہمیں سیدھا راستہ دکھا، ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا، جو محتوب نہیں  
ہوئے، جو بھٹکے ہوئے نہیں ہیں۔

### البقرہ

اس سورۃ کا نام بقرہ اس لیے ہے کہ اس میں ایک بگہ گائے کا ذکر آیا ہے۔ قرآن مجید  
کی ہر سورۃ میں اس قدر وسیع مضامین بیان ہوتے ہیں کہ ان کے لیے مضمون کے لحاظ سے جامع  
عنوانات تجویز نہیں کیے جاسکتے عربی زبان اگرچہ اپنی لغت کے اعتبار سے نہایت مالدار ہے، مگر  
بہر حال ہے تو انسانی زبان ہی۔ انسان جو زبانیں بھی بولتا ہے وہ اس قدر تنگ اور محدود ہیں کہ  
وہ ایسے الفاظ یا فقرے فراہم نہیں کر سکتیں جو ان وسیع مضامین کے لیے جامع عنوان بن سکتے

۱۔ عبادت = بندگی، غلامی، اطاعت، پرستش، گرویدگی۔

۲۔ سیدھے راستے سے مراد دنیوی زندگی کے ہر شعبہ میں خیالِ اولیٰ اور تبراؤ کا وہ طریقہ ہے جو بالکل صحیح ہو،  
جس پر چل کر انسان براہ راست اپنی فلاح و سعادت کی انتہائی منزل تک پہنچ جائے جس میں غلطی نہی اور غلط کاری  
کا خطرہ نہ ہو۔

۳۔ انعام سے مراد حقیقت مال و دولت اور دنیوی جاہ و عزت کی بخشش نہیں ہے، بلکہ اللہ کی رضا اور اس کی  
بارگاہ میں مقبولیت، اور اس کی میزان میں قدر کا سچی قرار پانا ہے۔ رہیں دنیوی نعمتیں، تو وہ اگر اللہ کے قانونِ شرعی کی  
اطاعت کرتے ہوئے حاصل ہوں تو ان پر بھی انعام کا اطلاق ہوگا، ورنہ وہ ابتلا اور استدراج کے قبیل کی چیزیں ہیں۔ ان کے چل کر  
قرآن میں اس حقیقت کو پوری صراحت کے ساتھ وضع کر دیا گیا ہے۔

۴۔ محتوب شخص اور بھٹکے ہوئے شخص میں فرق یہ ہے کہ بھٹکا ہوا وہ ہے جس پر سیدھا راستہ واضح ہی نہ ہو  
ہو اس لیے وہ غلط راستوں میں بھٹکتا پھر رہا ہو، اور محتوب وہ ہے جس پر براہ راست واضح ہو چکی ہو مگر وہ اپنی  
شرارتِ نفس کی وجہ سے قصداً اسے چھوڑ کر غلط راستہ پر چلے۔

ہوں۔ اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی رہنمائی سے قرآن کی بیشتر سورتوں کے لیے عنوانات کے بجائے نام تجویز فرمائے جو محض علامت کا کام دیتے ہیں۔ اس سورۃ کو بقرہ کہہ کر کامطلب یہ نہیں ہے کہ اس میں گائے کے مسئلے پر بحث کی گئی ہے بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ سورۃ جس میں گائے کا ذکر ہے۔“

اس سورۃ کا بیشتر حصہ ہجرت مدینہ کے بعد مدنی زندگی کے بالکل ابتدائی دور میں نازل ہوا ہے۔ اور کم تر حصہ ایسا ہے جو بعد میں نازل ہوا اور مناسبیت مضمون کے لحاظ سے اس میں شامل کر دیا گیا۔ حتیٰ کہ سورۃ کی ممانعت کے سلسلہ میں جو آیات نازل ہوئی ہیں وہ بھی اس میں شامل ہیں حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے بالکل آخری زمانہ میں اتری تھیں۔ سورۃ کا خاتمہ جن آیات پر ہوا ہے وہ ہجرت سے پہلے مکہ میں نازل ہو چکی تھیں مگر مضمون کی مناسبت سے ان کو بھی اسی سورۃ میں ضم کر دیا گیا ہے۔

اس سورۃ کو سمجھنے کے لیے پہلے اس کا تاریخی پس منظر اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے :-

۱۱) ہجرت سے قبل جب تک مکہ میں اسلام کی دعوت دی جاتی رہی، خطاب بیشتر مشرکین عرب سے تھا جن کے لیے اسلام کی آواز ایک نئی اور غیر مانوس آواز تھی۔ اب ہجرت کے بعد سابقہ یہودیوں سے پیش آیا جن کی بستیاں مدینہ سے بالکل متصل ہی واقع تھیں۔ یہ لوگ توحید، رسالت، وحی، آخرت اور ملائکہ کے قائل تھے، اس ضابطہ شرعی کو تسلیم کرتے تھے جو خدا کی طرف سے ان کے نبی موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا، اور صولاً ان کا دین وہی اسلام تھا جس کی تعلیم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے تھے، لیکن صدیوں کے مسلسل انحطاط نے ان کو اصل دین سے بہت دور مٹا دیا تھا۔ ان کے عقائد میں بہت سے غیر اسلامی عناصر کی آمیزش ہو گئی تھی جن کے لیے توراہ میں کوئی سند موجود نہ تھی۔ ان کی عملی زندگی میں بکثرت ایسے رسوم اور

طریقہ رواج پانگئے تھے جو اہل دین میں نہ تھے اور جن کے لیے توراہ میں کوئی ثبوت نہ تھا خود توراہ میں انھوں نے خدا کے کلام کے ساتھ انسانی کلام کو غلط ملط کر دیا تھا، اور خدا کا کلام جس حد تک اس میں لفظاً یا معنی محفوظ تھا اس کو بھی انھوں نے اپنی من مانی تاویلوں اور تفسیروں سے مسح کر رکھا تھا۔ دین کی حقیقی روح ان میں سے نکل چکی تھی اور ظاہری مذہبیت کا محض ایک بے جان ڈھانچہ باقی تھا جس کو وہ سینہ سے لگائے ہوئے تھے۔ ان کے علماء اور مشائخ، ان کے سردارانِ قوم اور ان کے عوام، سب کی اعتقادی، اخلاقی اور عملی حالت بگڑ گئی تھی۔ اور اپنے اس بگاڑ سے ان کو ایسی محبت بھی کہ وہ کبھی اصلاح کو قبول کرنے پر تیار نہ ہوتے تھے۔ صدیوں سے مسلسل ایسا ہو رہا تھا کہ جب کوئی اللہ کا بندہ انھیں دین کا سیدھا راستہ بتانے آتا تو وہ اسے اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے اور ہر ممکن طریقہ سے کوشش کرتے تھے کہ وہ کسی طرح اصلاح میں کامیاب نہ ہوسکے۔ یہ لوگ حقیقت میں بگڑے ہوئے مسلمان تھے جن کے ہاں بدعتوں اور تحریفوں، ٹوٹکائیوں اور فرقہ بندیوں، اتحاں گیری و غیر فکری، خدا فراموشی و دنیا پرستی کی بدولت ان خطاطوں میں حد کو پہنچ چکا تھا کہ وہ اپنا اصل نام دسلم، تنگ بھول گئے تھے، محض یہودی بن کر رہ گئے تھے اور اللہ کے دین کو انھوں نے محض نسل اسرائیل کی آبائی وراثت بنا کر رکھ دیا تھا پس جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہدایت فرمائی کہ ان کو اہل دین کی طرف دعوت دیں چنانچہ سورہ بقرہ کے ابتدائی بندہ سورہ رکوع اسی دعوت پر مشتمل ہیں۔ ان میں یہودیوں کی تاریخ اور ان کی اخلاقی و مذہبی حالت پر جس طرح تنقید کی گئی ہے، اور جس طرح ان کے بگڑے ہوئے مذہب و اخلاق کی نمایاں خصوصیات کے مقابلہ میں حقیقی دین کے اصول پہلو بہ پہلو پیش کیے گئے ہیں، اس سے یہ بات بالکل آئینے کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ایک پیغمبر کی امت کے بگاڑ کی جو عیبت کیا جاتی ہے، وہی دینداری کے مقابلہ میں حقیقی دینداری کس چیز کا نام ہے، دین حق کے نبیاری

اصول کیا ہیں اور خدا کی نگاہ میں اہل اہمیت کن چیزوں کی ہے۔

(۲) مدینہ پہنچ کر اسلامی دعوت ایک نئے مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ مکہ میں تو معاملہ فخر اصول دین کی تبلیغ اور دین قبول کرنے والوں کی اخلاقی تربیت تک محدود تھا، مگر جب ہجرت کے بعد عرب کے مختلف قبائل کے وہ سب لوگ جو اسلام قبول کر چکے تھے، ہر طرف سے سمت کے ایک جگہ جمع ہونے لگے اور انصار کی مدد سے ایک چھوٹی سی اسلامی ریاست کی بنیاد پڑ گئی تو اللہ تعالیٰ نے تمدن، معاشرت، معیشت، قانون اور ریاست کے متعلق بھی ہدایت بنی شروع کیں اور یہ بتایا کہ اسلام کی اساس پر یہ نیا نظام سیاسی کس طرح تعمیر کیا جائے۔ اس سورت کے آخری ۲۳ رکوع زیادہ تر انہی ہدایات پر مشتمل ہیں، جن میں سے اکثر ابتدا ہی میں بھیج دی گئی تھیں اور بعض متفرق طور پر حسب ضرورت بعد میں بھیجی جاتی رہیں۔

(۳) ہجرت کے بعد اسلام اور کفر کی کشمکش بھی ایک نئے مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ ہجرت سے پہلے اسلام کی دعوت خود کفر کے گھر میں دی جا رہی تھی اور متفرق قبائل میں سے جو لوگ اسلام قبول کرتے تھے وہ اپنی اپنی جگہ رہ کر ہی دین کی تبلیغ کرتے اور جواب میں مصائب اور مظالم کے تختہ مشق بنتے تھے مگر ہجرت کے بعد جب یہ منتشر مسلمان مدینہ میں جمع ہو کر ایک جوقاً بن گئے تو صورت حال یہ ہو گئی کہ ایک طرف ایک چھوٹی سی بستی تھی اور دوسری طرف تمام عرب اس جماعت اور اس تحریک کا امتیصال کر دینے پر تیار ہوا تھا۔ اب اس مٹھی بھر جماعت کی کامیابی کا ہی نہیں بلکہ اس کے وجود و بقا کا انحصار بھی اس بات پر تھا کہ آؤ لا وہ پوے بے جوش و خروش کے ساتھ اپنے مسلک کی تبلیغ کر کے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنا ہم عقیدہ بنانے کی کوشش کرے۔ ثانیاً وہ مخالفین کا برسر باطل ہونا اس طرح ثابت و مبرہن کرے کہ کسی ذی عقل انسان کو اس میں شبہ نہ رہے۔ ثالثاً بے خان و ماں ہونے اور تمام ملک کی عداوت و فرحت

سے دوچار ہونے کی بنا پر فقر و فاقہ اور بھدہ وقت بے امنی و بے اطمینانی کی جو حالت ان پر طاری ہو گئی تھی اور جس خطرات میں وہ چاروں طرف سے گھر گئے تھے، ان میں وہ ہر اسان نہ ہوں، پورے صبر و ثبات کے ساتھ ان حالات کا مقابلہ کریں اور اپنے غم میں ذرا تر نزل نہ آنے دیں۔ رابعا وہ پوری دلیری کے ساتھ ہر اس مسلح مزاحمت کا مسلح مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جائیں جو ان کی دعوت کو ناکام کرنے کے لیے کسی طاقت کی طرف سے کی جائے، اور اس بات کا ذرا پروا نہ کریں کہ مخالفین کی تعداد اور ان کی مادی طاقت کتنی زیادہ ہے۔ عموماً ان میں اتنی ہمت پیدا کی جائے کہ اگر عرب کے لوگ اس نئے نظام کو جو اسلام قائم کرنا چاہتا تھا، ہتھائش سے قبول نہ کریں، تو انھیں جاہلیت کے فاسد نظام زندگی کو زور مٹا دینے میں بھی تامل نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ میں ان پانچوں امور کے متعلق ابتدائی ہدایات دی ہیں، بعد میں یہ کشمکش جتنی بڑھتی گئی اسی کے مطابق زیادہ مفصل ہدایات بعد کی سورتوں میں نازل ہوتی رہیں۔

(۴) دعوت اسلامی کے اس مرحلے میں ایک نیا عنصر بھی ظاہر ہونا شروع ہو گیا تھا، اور یہ منافقین کا عنصر تھا۔ اگرچہ اس کے ابتدائی آثار مکہ کے آخری زمانہ میں بھی نمایاں ہونے لگے تھے، مگر وہ صرف اس حد تک تھے کہ کچھ لوگ اسلام کے برحق ہونے کے تو معترف ہو گئے تھے اور ایمان کا اقرار بھی کرتے تھے لیکن اس کے لیے تیار نہ تھے کہ اس حق کی خاطر اپنے مفاد کی قربانی، اپنے دنیوی تعلقات کا انقطاع، اور ان مصائب و شدائد کا نزول بھی برداشت کر لیں جو اس مسلک حق کو قبول کرنے کے ساتھ ہی نازل ہونے شروع ہو جاتے تھے۔ مدینہ پہنچ کر اس قسم کے منافقین کے علاوہ چند اور قسموں کے منافق بھی اسلامی جماعت میں پائے جانے لگے۔ ایک قسم کے منافق وہ تھے جو قطعاً اسلام کے منکر تھے اور محض فتنہ

برپا کرنے کے لیے جماعت مسلمانین میں داخل ہو جاتے تھے۔ دوسری قسم کے منافق وہ تھے جو اس جماعت کے دائرہ اقتدار میں گھر جانے کی وجہ سے اپنا مفاد اسی میں دیکھتے تھے کہ ایک طرف مسلمانوں میں بھی پناہ شمار کرائیں اور دوسری طرف مخالفین اسلام سے بھی ربط رکھیں تاکہ دونوں طرف کے فوائد سے مستفیع ہوں اور دونوں طرف کے خطرات سے محفوظ رہیں۔ تیسری قسم ان لوگوں کی تھی جو اسلام اور جاہلیت کے درمیان متردد تھے، انھیں اسلام کے برحق ہونے پر کامل اطمینان نہ تھا، مگر چونکہ ان کے قبیلہ، یا خاندان کے بیشتر لوگ مسلمان ہو چکے تھے اس لیے یہ بھی مسلمان ہو گئے تھے۔ چوتھی قسم وہ لوگ شامل تھے جو برحق ہونے کی حیثیت سے تو اسلام کے قائل ہو چکے تھے مگر جاہلیت کے طریقے چھوڑنے اور اخلاقی پابندیاں قبول کرنے اور فرائض اور ذمہ داریوں کا بار اٹھانے سے ان کا نفس انکار کرتا تھا۔ سورہ بقرہ کے نزول کے وقت ان منافقین کے ظہور کی محض ابتداء تھی اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف صرف اجمالی اشارات فرمائے ہیں، بعد میں جتنی جتنی ان کی صفات اور حرکات نمایاں ہوتی گئیں اسی قدر تفصیل کے ساتھ بعد کی سورتوں میں ہر قسم کے منافقین کے متعلق ان کی نوعیت کے لحاظ سے الگ الگ ہدایات بھی گئیں۔

اللہ کے نام سے، جو رحمان و رحیم ہے

الف، لام، میم۔ یہ اللہ کی کتاب ہے، اس میں کوئی شک نہیں۔

یہ حروف مقطعات قرآن کی بعض سورتوں کے آغاز میں لائے گئے ہیں۔ یہ جس سورہ کی ابتدا میں پائے جاتے ہیں اس کے لیے نام یا علامت کا فائدہ بھی دیتے ہیں، اقتدار کلام کے لیے اصل بات شروع کرنے سے پہلے خطیب کی طرف سامعین کی توجہ کھینچنے کا کام بھی ان سے لیا گیا ہے، اور ان میں ایک لطیف اشارہ اس طرف بھی ہے کہ یہ کلام اگرچہ انہی حروف و الفاظ سے مرکب ہے جو تمھاری زبان میں متعمل ہیں مگر پھر بھی تم اس کی نظر پیش کرنے سے عاجز ہو، اسی لیے جن جن سورتوں کے آغاز میں یہ حروف آئے ہیں ان سب میں قرآن کے اعجاز اور اس کے دلیل نبوت ہونے کا دعویٰ موجود ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب اس طرز بیان سے نامانوس نہ تھے کیونکہ انھوں نے

(باقی حاشیہ صفحہ ۲۳ پر ملاحظہ ہو)

یہ ہدایت ہے متقی لوگوں کے لیے جو غیب پر ایمان لائیں، نماز قائم کریں، جو رزق ہم نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲) قرآن کی شدید مخالفت کرنے کے باوجود کبھی حردن مقطعات کے احتمال پر اعتراض تو درکنار کسی شبہ تک کا اظہار نہ کیا۔

۱۵ اس کا ایک سیدھا سادہ مطلب تو یہ ہے کہ ”میشک یہ الشد کی کتاب ہے“ مگر ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایسی کتاب ہے جس میں شک کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ دنیا میں جتنی کتابیں امور بالبعد الطبیعت اور حقائق ماوراء ادراک سے بحث کرتی ہیں وہ سب قیاس و گمان پر مبنی ہیں، اس لیے خود ان کے مصنف بھی اپنے بیانات کے بارے میں شک سے پاک نہیں ہو سکتے خواہ وہ کتنے ہی یقین کا اظہار کریں۔ لیکن ایسی کتاب ہے جو سراسر علم حقیقت پر مبنی ہے، اس کا مصنف وہ ہے جو تمام حقیقتوں کا علم رکھتا ہے اس لیے فی الواقع اس میں شک کے لیے کوئی جگہ نہیں، یہ دوسری بات ہے کہ انسان اپنی نادانی کی بنا پر اس کے بیانات میں شک کریں۔

(حواشی صفحہ ۱۵) مطلب یہ ہے کہ یہ کتاب سراسر رہنمائی ہے، مگر دنیا میں زندگی بسر کرنے کا جو راستہ یہ بتاتی ہے اس سے وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں، وہی اس پر چل سکتے ہیں، بلکہ وہی لوگ اس راستہ کو دیکھ سکتے اور اس کی صحیح قدر جان سکتے ہیں جن میں یہ صفات پائی جائیں۔

۱۶ متقی = لغوی معنی: اپنا بچاؤ کرنے والا۔ اصطلاحی معنی: وہ جو خدا کی ناراضی سے ڈرتا ہو، ان برائیوں سے بچنا چاہتا ہو جو خدا کے نزدیک ناپسندیدہ ہوں، اور ان بھلائیوں پر عمل کرنے کا خواہشمند ہو جو خدا کے نزدیک پسندیدہ ہیں۔ قرآن کی رہنمائی سے فائدہ اٹھانے کے لیے یہ اولین شرط ہے۔ جو شخص خدا سے بے خوف ہو، جسے بھلے اور بُرے کی تیز سے کوئی لچھی، برائی سے بچنے کی کوئی فکر، بھلائی کے طریقہ کی کوئی جستجو نہ ہو، اور جو اخلاقی قیود سے آزاد رہ کر کمال جانوروں کی سی زندگی بسر کرنا چاہتا ہو اس کے لیے قرآن میں کوئی ہدایت نہیں۔

۱۷ غیب سے مراد وہ حقیقتیں ہیں جو انسان کے علم و ادراک سے ماوراء ہیں، مثلاً خدا کی ذات و صفات، ملائکہ، وحی، آخرت۔ ان حقیقتوں کو نبی کے اعتماد پر تسلیم کر لینے کا نام ایمان بالغیب ہے، یعنی بے دیکھی چیز کو ماننا۔ جو شخص محسوسات سے ماوراء کی حقیقت کو ماننے کے لیے تیار نہ ہو اس کا نقطہ نظر لامحالہ مادہ پرستانہ ہو گا۔ اس کے لیے ایک قدم بھی اس راستہ پر چلنا محال ہے جو قرآن پیش کرتا ہے، کیونکہ اس راستہ کا تو سارا دار مدار ہی اللہ کے اقتدار اعلیٰ (باقی صفحہ ۲۴) پر

ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کوں، جو ہدایت تم پر نازل کی گئی ہے اور جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھی اس کو قبول کرین، اور آخرت پر یقین رکھیں۔ ایسے لوگ اپنے رب کی طرف سے صحیح روٹیہ پر ہیں اور یہی فلاح پانے والے ہیں۔

جو لوگ ان باتوں کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیں، ان کے لیے یکساں ہے خواہ تم انہیں خبر دے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۳) اور اس کی ہدایت بذریعہ وحی اور آخرت کی باز پرس کو ماننے پر ہے۔

۱۵ اقامت صلوٰۃ یا نماز قائم کرنا ایک جامع اصطلاح ہے جس میں نہ صرف انفرادی حیثیت سے تمام شرائط و قواعد کی پابندی کے ساتھ نماز ادا کرنا اور ہمیشہ ادا کرتے رہنا، بلکہ اجتماعی حیثیت سے نماز کا باقاعدہ نظام قائم کرنا بھی شامل ہے۔ قرآن کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے کے لیے یہ بھی ناگزیر شرط ہے، کیونکہ جو شخص اس راستہ پر عملاً چلنے کے لیے تیار نہ ہو، اس کا محض راستہ کا جان لینا اور مان لینا نتیجہ خیر نہیں ہو سکتا۔ اور اس راستہ پر عملاً چلنے کے لیے جو چیز آدمی کو تیار کرتی اور اس کی استعداد عمل کو پرورش کرتی ہے وہ نماز ہی ہے۔

(حواشی صفحہ ۲۴) یعنی وہ تنگ دل نہ ہوں، زبردست نہ ہوں، ان کے مال میں خدا اور بندوں کے جو حقوق مقرر کیے جائیں انہیں ادا کرنے کے لیے تیار ہوں، جس چیز پر ایمان لاتے ہیں اس کی خاطر مالی قربانی کرنے میں بھی دریغ نہ کریں ۱۵ تم کا خطاب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔

۱۶ یہ ایک عام غلطی ہے کہ اسلام کی تاریخ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے شروع کی جاتی ہے اور آنحضرت کو اس حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے کہ گویا آپ ہی سے اسلام کا آغاز ہوا۔ اسی غلط فہمی کی بنا پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ پچھلے نبیاً اور ان کی کتابوں پر ایمان لانا محض رواداری کے قبیل کی ایک چیز ہے۔ حالانکہ دراصل ابتدائے آفرینش سے جتنے بھی نبیاً آئے ہیں، ان کا دین یہی اسلام تھا، اور جتنی کتابیں اللہ کی طرف سے آئیں ان سب کی وہی ایک تعلیم تھی جو قرآن میں دی گئی ہے۔ قرآن اور نبوت محمدی اس سلسلہ سے کوئی الگ چیز نہیں ہے بلکہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ لہذا جو شخص بھی اسلام قبول کرے اس کے لیے ناگزیر ہے کہ انبیاء اور کتب الہی کے پورے سلسلہ سے اپنا تعلق جوڑے، نہ کہ اس کی ایک کڑی سے۔



کر دیا نہ کرو بہر حال وہ ماننے والے نہیں ہیں۔ اللہ نے ان کے دلوں اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے، ان کی آنکھوں پر پردہ پڑ گیا ہے، اور وہ سخت سزا کے مستحق ہیں۔

بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لائے ہیں، حالانکہ حقیقت وہ مومن نہیں ہیں۔ وہ اپنی دانست میں اللہ اور ایمان لانے والوں کے ساتھ دھوکہ بازی کرتے ہیں، حالانکہ فی الواقع وہ خود اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں مگر نہیں سمجھتے۔ ان کے دلوں میں ایک بیماری ہے جسے اللہ نے اور زیادہ بڑھا دیا، اور جو تھوٹ وہ بولتے ہیں اس کی پاداش میں ان کو دردناک سزا ملنے والی ہے۔ جیلان سے کہا گیا کہ زمین میں فساد برپا نہ کرو تو انھوں نے

۱۵۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ نے ہر لگادی تھی اس لیے انھوں نے تسلیم کرنے سے انکار کیا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جیلانوں نے ان بنیادی امور کو رذکر دیا جن کا ذکر کر دیا گیا ہے، اور اپنے لیے قرآن کے پیش کردہ راستے کے خلاف دو سزا راستہ پر کر لیا تو اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی۔ اس مہر لگنے کی کیفیت کا تجربہ ہر اس شخص کو ہو گا جسے کبھی تبلیغ کا اتفاق ہوا ہو جب کوئی شخص آپ کے پیش کردہ طریقہ کو جانچنے کے بعد ایک دفعہ رد کر دیتا ہے تو اس کا ذہن اس طرح بالکل الٹی رفتار پر چل پڑتا ہے کہ آپ کی کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی، آپ کی دعوت کے لیے اس کے کان بہرے، اور آپ کے طریقہ کی خوبیوں کے لیے اس کی آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں، اور صریح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ فی الواقع اس کے دل پر مہر لگی ہوئی ہے۔

۱۶۔ یعنی وہ اپنے آپ کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر رہے ہیں کہ ان کی یہ منافقانہ روش ان کے لیے مفید ہوگی، حالانکہ دراصل یہ ان کو دنیا میں بھی نقصان پہنچائے گی اور آخرت میں بھی۔

۱۷۔ بیماری سے مراد منافقت کی بیماری ہے۔ اور اللہ کے اس بیماری میں افسانہ کرنے کی کیفیت یہ ہے کہ اس منافقانہ روش کی سزا وہ انھیں فوراً نہیں دیتا بلکہ انھیں ڈھیل دیتا ہے اور اس ڈھیل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنی منافقانہ چالوں کو بظاہر کامیاب ہوتے دیکھ کر وہ اور زیادہ مکمل منافق بنتے چلے جاتے ہیں۔

یہی کہا کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ خبردار! حقیقت میں ہی لوگ مفسد ہیں مگر انہیں شعور نہیں ہے۔ اور جب ان سے کہا گیا کہ جس طرح دوسرے لوگ ایمان لائے ہیں اسی طرح تم بھی ایمان لاؤ تو انہوں نے یہی جوابے یا کہ کیا ہم بے وقوفوں کی طرح ایمان لائیں؟۔ خبردار! حقیقت میں تو یہ خود بے وقوف ہیں مگر یہ جانتے نہیں ہیں۔ جب یلہل ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان رکھتے ہیں، اور جب علیحدگی میں اپنے شیطانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اہل میں تو ہم تمہارے ساتھ ہیں اور ان لوگوں سے محض مذاق کر رہے ہیں۔ اللہ ان سے مذاق کر رہا ہے، وہ ان کی رسی دراز کیے جاتا ہے اور یہ اپنی سرکشی میں اندھوں کی طرح بھٹکتے چلے جاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی، مگر یہ سوچا بھی ان کے لیے نفع بخش نہ ہوا، اور ہدایت قبول کرنے والے تو یہ بھی

۱۰ لگائی بھائی، سازشیں کرنا، ہر فریق کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکانا، طرفین کو اپنی مدد کا جھوٹا بین دلانا اور وقت پر کسی کے ساتھ وفانہ کرنا، اپنی اغراض کے لیے حق و صداقت کا راستہ روکنا، یہ منافی کاشیوہ ہے اور اس سے زمین میں فساد پھیلتا ہے نہ کہ اصلاح ہوتی ہے۔ مگر منافی ہمیشہ اپنے آپ کو مصلح ہی کے روپ میں پیش کرتا ہے۔

۱۱ یعنی جس طرح دوسرے مسلمان دیانت اور راستی کے ساتھ مسلمان ہوئے ہیں اسی طرح تم بھی اگر اسلام قبول کرتے ہو تو ایمان داری کے ساتھ سچے دل سے قبول کرو۔

۱۲ وہ اپنے نزدیک ان لوگوں کو بے وقوف سمجھتے تھے جو سچائی کے ساتھ اسلام قبول کر کے اپنے آپ کو تکلیفوں اور مشقتوں اور خطرات میں مبتلا کر رہے تھے۔ ان کی رائے میں یہ سلسلہ متقاناہ فعل تھا کہ محض حق اور راستی کی خاطر تمام ملک کی دشمنی مول لے لی جائے۔ ان کے خیال میں عقلمندی یہ تھی کہ آدمی حق اور باطل کی بحث میں نہ پڑے بلکہ ہر معاملہ میں صرف اپنے مفاد کو دیکھے۔

۱۳ شیطان کے معنی سرکش، متمرد، شوریدہ سر کے ہیں۔ انسان اور جن دونوں کے لیے یہ لفظ مستعمل ہوتا ہے۔ اگرچہ قرآن میں یہ لفظ زیادہ تر شیاطین جن کے لیے آیا ہے، لیکن بعض مقامات پر شیطان صفت انسانوں کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے اور ساق و ساق سے باسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ کہاں شیطان سے انسان (باقی صفحہ ۲۷ پر)۔

نہیں۔ ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے آگ روشن کی اور جب سارا ماحول روشن ہو گیا تو اللہ نے ان کا نور بصارت سلب کر لیا اور انھیں اس حال میں چھوڑ دیا کہ تاریکیوں میں انھیں کچھ نظر نہیں آتا۔ یہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، یہ اب نہ بلشیں گے۔ یا پھر ان کی مثال یوں سمجھو کہ آسمان سے زور کی بارش ہو رہی ہے اور اس کے ساتھ اندھیری گھٹا اور کڑک اور چمک بھی ہے۔ یہ بجلی کے کڑاکے سن کر اپنی جانوں کے خوف سے کانوں میں انگلیاں ٹھونسنے لیتے ہیں اور حال یہ ہے کہ اللہ ان منکرین حق کو ہر طرف سے گھیرے میں لے رکھا ہے۔ بجلی کی چمک سے ان کی یہ حالت ہے

(بقیہ صفحہ ۲۶) مراد ہیں اور کہاں جن۔ اس مقام پر شیاطین کا لفظ ان بڑے بڑے سرداروں کے لیے استعمال ہوا ہے جو اُس وقت اسلام کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔

۵ اس سارے معاملہ کو تجارت سے تعبیر کرنے میں ایک لطیف تعریف ہے۔ دراصل وہ یہ سب کچھ کاروباری ذہنیت ہی کے ساتھ کر رہے تھے۔ ان کے ذہن سوداگری سے بالاتر کسی چیز کا تصور ہی نہ کر سکتے تھے۔

(حاشی صفحہ ۲۶) ۱۔ مطلب یہ ہے کہ جب ایک اللہ کے بندے نے روشنی پھیلانی اور حق کو باطل سے صحیح کو غلط سے، راہ راست کو گمراہیوں سے چھانٹ کر بالکل نمایاں کر دیا، تو جو لوگ دیدہ بینا رکھتے تھے ان پر تو ساری حقیقتیں روشن ہو گئیں، مگر یہ منافق جو نفس پرستی میں اندھے ہو رہے تھے ان کو اس روشنی میں کچھ نظر نہ آیا۔ اللہ نے نور بصارت سلب کر لیا کے الفاظ سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ان کے تاریکی میں بھٹکنے کی ذمہ داری خود ان پر نہیں ہے۔ اللہ نور بصارت ہی کا سلب کرتا ہے جو خود حق کا طالب نہیں ہوتا، خود ہدایت کے بجائے گمراہی کو اپنے لیے پسند کرتا ہے، خود صداقت کا روشن چہرہ نہیں دیکھنا چاہتا۔ جب انھوں نے نور حق سے منہ پھیر کر ظلمتِ باطل ہی میں بھٹکنا چاہا تو اللہ نے انھیں اسی کی توفیق عطا فرمادی۔

۲۔ حق بات سننے کے لیے بہرے، حق گوئی کے لیے گونگے، حق بینی کے لیے اندھے۔

کہ گویا عنقریب ان کی بصارت غائب ہو جائے گی جب ذرا کچھ روشنی انھیں محسوس ہوتی ہو تو اس میں کچھ دور چل لیتے ہیں اور جب ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اللہ چاہتا تو ان کی سماعت اور بصارت بالکل ہی سلب کر لیتا کہ وہ یقیناً ہر چیز پر قادر ہے۔

لوگو! بندگی اختیار کرو اپنے اس رب کی جو تمہارا اور تم سے پہلے جو لوگ ہو گزرے ہیں ان سب کا خالق ہے، تمہارے بچنے کی توقع اسی صورت سے ہو سکتی ہے۔ وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین کا فرش بچھایا، آسمان کی چھت بنائی، اوپر سے پانی برسایا اور اس کے ذریعہ سے ہر طرح کی پیداوار

میں پہلی مثال ان منافقین کی تھی جو دل میں قطعی منکر تھے اور کسی غرض و مصلحت سے مسلمان بن گئے تھے۔ دوسری مثال ان کی ہے جو شک اور تذبذب اور ضعف ایمان میں مبتلا تھے، کچھ حق کے قائل بھی تھے مگر ایسی حق پرستی کے قائل نہ تھے کہ اس کی خاطر تکلیفوں اور مصیبتوں کو بھی برداشت کر جائیں۔ اس مثال میں بارش سے مراد اسلام ہے جو انسانیت کے لیے رحمت بن کر آیا، اندھیری گھٹا اور کراک اور چمک سے مراد مشکلات و مصائب کا وہ ہجوم اور وہ سخت مجاہدہ ہے جو تحریک اسلامی کے مقابلہ میں اہل جاہلیت کی شدید فراموشی کے سبب سے پیش آرہا تھا۔ مثال کے آخری حصے میں ان کی اس کیفیت کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ جب معاملہ ذرا اہل ہوتا ہے تو پہل پڑتے ہیں اور جب مشکلات کے دل بادل چھانے لگتے ہیں، یا ایسے احکام دیے جاتے ہیں جن سے ان کی خواہشات نفس اور ان کے تعصبات جاہلیت پر ضرب پڑتی ہے تو ٹھنک کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

علیٰ یعنی جس طرح پہلی قسم کے منافقین کا نور بصارت اس نے بالکل سلب کر لیا، اسی طرح اللہ ان کو بھی حق کے لیے اندھا بنا رہا، مگر اللہ کا یہ قاعدہ نہیں ہے کہ جو کسی حد تک بکھنا اور سننا چاہتا ہو اسے اتنا بھی نہ دیکھنے سننے سے جس قدر حق دیکھنے اور حق سننے کے لیے یہ تیار تھے اسی قدر سماعت و بصارت اللہ نے ان کے پاس رہنے دی۔

۱۱۔ اگرچہ قرآن کی دعوت تمام انسانوں کے لیے عام ہے، مگر اس دعوت کا فائدہ اٹھانا یا نہ اٹھانا لوگوں کی اپنی آمادگی اور اس آمادگی کے مطابق اللہ کی توفیق پر منحصر ہے۔ لہذا پہلے انسانوں کے درمیان فرق کر کے واضح کر دیا گیا کہ کس قسم کے لوگ اس کتاب کی رہنمائی سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اور کس قسم کے نہیں اٹھا سکتے۔ اس کے بعد اب تمام نوع انسانی کے سامنے وہ چیز پیش کی جاتی ہے جس کی طرف بلانے کے لیے قرآن آیا ہے۔

۱۲۔ بچنے سے مراد دنیا میں غلط فہمی و غلط کاری سے اور آخرت میں خدا کے عذاب سے محفوظ رہنا ہے۔

نحال کہ تمہارے لیے رزق بہم پہنچایا، پس جب تم یہ جانتے ہو تو دوسروں کو اللہ کا مد مقابل نہ ٹھہراؤ۔ اور اگر تمہیں اس امر میں شک ہے کہ جو کتاب ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے وہ ہماری ہے یا نہیں، تو اس کے مانند ایک ہی سورت بنا لاؤ، اپنے سارے ہم فواؤں کو بلا لو، ایک اللہ کو چھوڑ کر باقی جس جس کی چاہو مدد لے لو، اگر تم سچے ہو تو یہ کام کر کے دکھاؤ۔ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا، اور یقیناً کبھی نہیں کر سکتے تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن نہیں گے انسان اور پتھر، جو بہتیا کی گئی ہے نکرین حق کے لیے۔ اور اے پیغمبر! جو لوگ اس کتاب پر ایمان لائیں اور (اس کے مطابق) اپنے عمل درست کر لیں انھیں خوشخبری دیدو کہ ان کے لیے باغ ہیں جن کے نیچے دریا بہتے ہوں گے۔ ان باغوں کے پھل صورت میں دنیا کے پھلوں سے ملتے جلتے ہوں گے، جب کوئی پھل انھیں کھانے کو دیا جائے گا تو وہ کہیں گے کہ ایسے ہی پھل اس سے پہلے دنیا میں ہم کو دیے جاتے تھے۔ ان کے لیے وہاں پاکیزہ بیویاں ہونگی، اور وہ وہاں ہمیشہ رہیں گے۔ ہاں، اللہ اس سے ہرگز نہیں شرماتا کہ مچھریا اس سے بھی حقیر تر کی چیز

۱۷ یعنی جب تم خود بھی اس بات کے قائل ہو اور تمہیں معلوم ہے کہ یہ سب تخلیق و تدبیر اللہ ہی کی ہے تو تمہاری تنگی اسی کے لیے خاص ہونی چاہیے، دوسرا کون اس کا حق دار ہو سکتا ہے کہ تم اس کی بندگی بجالاؤ؟ دوسروں کو اللہ کا مد مقابل ٹھہرنے سے مراد یہ ہے کہ بندگی کی مختلف نوع میں سے کسی نوع کا رویہ ان کے ساتھ اختیار کیا جائے۔ آگے چل کر خود قرآن ہی سے تفصیل کے ساتھ معلوم ہو جائے گا کہ بندگی کی یہ انواع کون کون سی ہیں جنھیں اللہ کے لیے مخصوص ہونا چاہیے۔

۱۸ اس سے پہلے مکہ میں کئی باریہ چیلنج دیا جا چکا تھا کہ اگر تم اس قرآن کو انسان کی تصنیف سمجھتے ہو تو اس کے مانند کوئی کلام تصنیف کر کے دکھاؤ۔ اب مدینہ پہنچ کر پھر اسی کا اعادہ کیا جا رہا ہے۔

۱۹ اس میں یہ لطیف اشارہ ہے کہ وہاں صرف تم ہی دوزخ کا زندہ نہ بنو گے بلکہ تمہارے وہ بُت بھی ان تمہارے ساتھ ہی موجود ہوں گے جنھیں تم نے اپنا مبودوسجود بنا رکھا ہے۔ اس وقت تمہیں خود معلوم ہو جائے گا کہ خدائی میں یہ کتنا دخل رکھتے تھے۔

کی تمثیلیں دے۔ جو لوگ حق بات کو قبول کرنے والے ہیں وہ انہی تمثیلوں کو دیکھ کر جان لیتے ہیں کہ یہ حق ہے جو ان کے رب ہی کی طرف سے آیا ہے، اور جو ماننے والے نہیں ہیں وہ انہیں سن کر کہنے لگتے ہیں کہ ایسی تمثیلوں سے اللہ کو کیا سروکار؟ اس طرح اللہ ایک ہی بات سے بہتوں کو گمراہی میں مبتلا کر دیتا ہے اور بہتوں کو راہ راست دکھا دیتا ہے۔ اور گمراہی میں وہ انہی کو مبتلا کرتا ہے جو فسق ہیں، جو اللہ کے ہمد کو مضبوط باندھ لینے کے بعد توڑتے ہیں، جو ان راہ طوں کو کاٹتے ہیں جنہیں اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے، جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں، اور اس روش سے وہ خود ہی نقصان اٹھانے والے ہیں۔

تم اللہ کے ساتھ کفر و بناوٹ کا رویہ کیسے اختیار کرتے ہو حالانکہ تم بے جان تھے، اس نے تم کو زندگی عطا کی، پھر وہی تمہاری جان سلب کرے گا، پھر وہی تمہیں دوبارہ زندگی عطا کرے گا، پھر اسی کی طرف تمہیں پلٹ کر جانا ہے۔ وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں، پھر

۱۷ یہ ایک اعتراض کا جواب ہے جو مخالفین کی طرف سے کیا جاتا تھا۔ قرآن میں متعدد مقامات پر توضیح مدعا کے لیے مکرری، کبھی وغیرہ کی تمثیلیں دی گئی ہیں۔ اس پر ان لوگوں کا اعتراض تھا کہ یہ کیسا کلام الہی ہے جس میں ایسی حقیر چیزوں کی تمثیلیں ہیں۔

۱۸ یعنی جو لوگ بات کو سمجھنا نہیں چاہتے، حقیقت کی جستجو نہیں رکھتے ان کی نگاہیں تو بس ظاہری الفاظ میں اٹک کر رہ جاتی ہیں اور وہ ان چیزوں سے اُلٹے نتائج نکال کر حق سے اور زیادہ دور چلے جاتے ہیں۔ بعکس اس کے جو خود حقیقت کے طالب ہیں اور صحیح بصیرت رکھتے ہیں ان کو انہی باتوں میں حکمت کے جوہر نظر آتے ہیں اور ان کا دل گواہی دیتا ہے کہ ایسی حکیمانہ باتیں اللہ ہی کی طرف سے ہو سکتی ہیں۔

۱۹ فاسق = نافرمان، اطاعت کی حد سے نکل جانے والا۔

۲۰ بادشاہ اپنے ملازموں اور رعایا کے نام جو فرمان یا ہدایت جاری کرتا ہے اس کو عربی محاورہ میں عہد تعبیر کیا جاتا ہے کیونکہ اس کی تعمیل مان پر واجب ہوتی ہے۔ یہاں عہد کا لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اللہ کے عہد سے مراد اس کا وہ مستقل فرمان ہے جس کی رو سے تمام نوع انسانی صرف اسی کی بندگی، اطاعت و درپردہ کئے پر مامور ہے۔ "مضبوط باندھ لینے کے بعد" سے اشارہ اس طرف کہ آدم کی تخلیق کے وقت تمام نوع انسانی کو اس فرمان کی پابندی کا اقرار لے لیا گیا تھا۔

اوپر کی طرف توجہ فرمائی اور سات آسمان استوار کیے۔ اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔  
پھر ذرا اس وقت کا تصور کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ ”میں زمین میں

سات آسمانوں کی حقیقت کیا ہے اس کا تین مشکل ہے۔ انسان ہر زمانہ میں آسمان، یا بالفاظ دیگر ماورائے زمین کے متعلق اپنے مشاہدات یا قیاسات کے مطابق مختلف تصورات قائم کرتا رہا ہے جو برابر بدلتے رہے ہیں۔ لہذا ان میں سے کسی تصور کو مینا قرار دینے کے لیے قرآن کے ان الفاظ کا مفہوم متعین کرنا صحیح نہ ہوگا بس مجھ اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ یا تو اس سے مراد یہ ہے کہ زمین سے ماوراء جس قدر کائنات ہے اسے اللہ نے سات محکم طبقات میں تقسیم کر رکھا ہے، یا یہ کہ زمین اس کائنات کے جس حلقہ میں واقع ہے وہ سات طبقات پر مشتمل ہے۔

۱۵ اس فقرے میں دو اہم حقیقتوں پر متنبہ فرمایا گیا ہے۔ ایک یہ کہ تم اس خدا کے مقابلہ میں کفر و بغاوت کا رویہ اختیار کرنے کی جرات کیسے کرتے ہو جو تمہاری تمام حرکات سے باخبر ہے، جس سے تمہاری کوئی حرکت چھپی ہوئی نہیں رہ سکتی۔ دوسرے یہ کہ جو خدا تمام حقائق کا علم رکھتا ہے، جو حقیقت علم کا سرچشمہ ہے اس سے منہ موڑ کر بجز اس کے کہ تم جہالت کی تاریکیوں میں بھٹکو اور کیا نتیجہ نکل سکتا ہے جب اس کے سوا علم کا اور کوئی منبع ہی نہیں ہے، جب اس کے سوا اور کسی سے وہ روشنی نہیں مل سکتی جس میں تم اپنی زندگی کا راتہ صاف دیکھ سکو تو آخر اس سے روگردانی کرنے میں کیا فائدہ تم نے دیکھا ہے؟

۱۶ اوپر رکوع میں بندگی رب کی دعوت اس بنیاد پر دی گئی تھی کہ وہ تمہارا خالق ہے، پروردگار ہے اسی کے قبضہ قدرت میں تمہاری زندگی و موت ہے، اور جس کائنات میں تم رہتے ہو اس کا مالک و مدبّر ہی ہے، لہذا اس کی بندگی کے سوا تمہارے لیے اور کوئی دوسرا طریقہ صحیح نہیں ہو سکتا۔ اب اس رکوع میں وہی دعوت اس بنیاد پر دی جا رہی ہے کہ اس دنیا میں تم کو خدا نے اپنا خلیفہ بنایا ہے، خلیفہ ہونے کی حیثیت سے تمہارا فرض صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ اس کی بندگی کرو بلکہ یہ بھی ہے کہ اس کی بھیجی ہوئی ہدایت کے مطابق کام کرو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا اور اپنے ازلی دشمن شیطان کے اشاروں پر چلے تو بدترین بغاوت کے مجرم ہو گے اور بدترین انجام دیکھو گے۔

اس سلسلہ میں انسان کی حقیقت اور کائنات میں اس کی حیثیت ٹھیک ٹھیک بیان کر دی گئی ہے اور نوح انسانی کی تاریخ کا وہ باب پیش کیا گیا ہے جس کے معلوم ہونے کا کوئی دوسرا ذریعہ انسان کو میسر نہیں ہے۔ اس باب سے جو اہم نتائج حاصل ہوتے ہیں وہ ان نتائج سے بہت زیادہ قیمتی ہیں جو زمین کی تہوں سے متفرق ہڈیاں نکال کر

(باقی صفحہ ۳۲ پر)

ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔" انھوں نے عرض کیا کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں جو اس کے انتظام کو بگاڑ دے گا اور خوزریاں کرے گا؟ آپ کی حمد و ثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کے لیے تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں۔" فرمایا "میں جانتا ہوں جو کچھ تم نہیں جانتے۔" اس کے بعد اللہ نے

(بقیہ صفحہ ۳۱) اور انھیں قیاس و تخمین سے ربط دے کر آدمی اخذ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

۱۷۰ فلک کے اصل معنی عربی میں پیامبر کے ہیں اسی کا لفظی ترجمہ فرشتہ ہے۔ یہ بعض مجرد قوتیں نہیں ہیں جو شخص نہ رکھتی ہوں، بلکہ یہ شخصیت رکھنے والی ہتیاں ہیں جن سے اللہ اپنی اس عظیم شان سلطنت کی تدبیر و انتظام میں کام لیتا ہے۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ یہ سلطنت اللہ ہی کے اہل کار ہیں جو اللہ کے احکام کو نافذ کرتے ہیں۔ جاہل لوگ انھیں غلطی سے خدائی میں حصہ دار سمجھ بیٹھے اور بعض نے انھیں خدا کا فرستہ دار سمجھا اور ان کو دوتا بنا کر ان کی پرستش شروع کر دی۔

(حاشی صفحہ ۱۷۱) ۱۷۱ خلیفہ = وہ جو کسی کی ملک میں اُس کے تفویض کردہ اختیارات اُس کے نائب کی حیثیت سے استعمال کرے۔ خلیفہ مالک نہیں ہوتا بلکہ اہل مالک کا نائب ہوتا ہے۔ اس کے اختیارات ذاتی نہیں ہوتے بلکہ مالک کے عطا کردہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے منشاء کے مطابق کام کرنے کا حق نہیں رکھتا بلکہ اس کا کام مالک کے منشاء کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ اگر وہ خود اپنے آپ کو مالک سمجھ بیٹھے اور تفویض کردہ اختیارات کو منہ مانے طریقہ سے استعمال کرنے لگے، یا اہل مالک کے سوا کسی اور کو مالک تسلیم کر کے اس کے منشاء کی پیروی اور اس کے احکام کی تعمیل کرنے لگے تو یہ سب غداری و بغاوت کے افعال ہوں گے۔

۱۷۲ یہ فرشتوں کا اعتراف نہیں تھا بلکہ استفہام تھا۔ فرشتوں کی کیا مجال کہ خدا کی کسی تجویز پر اعتراض کریں۔ وہ خلیفہ کے لفظ سے یہ تو سمجھ گئے تھے کہ اس زیر تجویز مخلوق کو زمین میں کچھ اختیارات سپرد کیے جانے والے ہیں مگر یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ سلطنت کائنات کے اس نظام میں کسی با اختیار مخلوق کی گنجائش کیسے ہو سکتی ہے، اور اگر کسی کی طرف کچھ ذرا سے بھی اختیارات منتقل کر دیے جائیں تو سلطنت کے جن حصہ میں بھی ایسا کیا جائے گا وہاں کا انتظام خرابی سے کیسے بچ جائے گا۔ اسی بات کو وہ سمجھنا چاہتے تھے۔

۱۷۳ اس فقرہ سے فرشتوں کا مدعا یہ نہ تھا کہ خلافت ہمیں دی جائے، ہم اس کے مستحق ہیں، بلکہ ان کا مطلب یہ تھا کہ حضور کے فریض کی تعمیل ہو رہی ہے، آپ کے احکام میں جالانے میں ہم پوری طرح سرگرم ہیں اور باقی صفحہ ۳۳



آدم کو ساری چیزوں کے نام سکھائے، پھر انھیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا ”اگر تمھارا خیال صحیح ہے (کہ کسی خلیفہ کے تقرر سے انتظام بگڑ جائے گا، تو ذرا ان چیزوں کے نام بتاؤ۔“ انھوں نے عرض کیا ”نقص سے پاک تو آپ ہی کی ذات ہے، ہم تو بس اتنا ہی علم رکھتے ہیں جتنا آپ نے ہم کو دے دیا ہے۔ حقیقت میں سب کچھ جاننے اور سمجھنے والا آپ کے سوا کوئی نہیں۔“ پھر اللہ نے آدم سے کہا ”تم انھیں ان چیزوں کے نام بتاؤ۔“ جب اس نے ان کو سارے نام

(بقیہ صفحہ ۳۲) مرضی مبارک کے مطابق سارا جہان پاک صاف دکھا جاتا ہے اور اس کے ساتھ آپ کی حمد و ثنا اور آپ کی تسبیح و تقدیس بھی ہم خدام ادب کر رہے ہیں، اب کی کس چیز کی ہے کہ اس کے لیے ایک خلیفہ کی ضرورت ہو؟ ہم اس کی مصلحت نہیں سمجھ سکے۔ (تسبیح کا لفظ ذومعنی ہے، اس کے معنی پاکی بیان کرنے کے بھی ہیں، اور سرگرمی کے ساتھ کام اور اہتمام کے ساتھ سعی کرنے کے بھی۔ اسی طرح تقدیس کے بھی ذومعنی ہیں، ایک تقدس کا اظہار و بیان، دوسرے پاک کرنا،

۱۰۰۰ یہ فرشتوں کے دوسرے شبہ کا جواب ہے۔ یعنی فرمایا کہ خلیفہ مقرر کرنے کی ضرورت و مصلحت میں جانتا ہوں، تم اسے نہیں سمجھ سکتے۔ اپنی جن خدمات کا تم ذکر کر رہے ہو وہ کافی نہیں ہیں بلکہ ان سے بڑھ کر کچھ مطلوب ہے۔

(حواشی صفحہ ۱۰) انسان کے علم کی صورت دراصل یہی ہے کہ وہ ناموں کے ذریعہ سے اشیاء کے علم کو اپنے ذہن کی گرفت میں لاتا ہے، لہذا انسان کی تمام معلومات دراصل اسما و اشیاء پر مشتمل ہیں۔ آدم کو سارے نام سکھانا گویا ان تمام اشیاء کا علم دینا تھا جن کے نام انھیں سکھائے گئے تھے۔

۱۰۰۰ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر فرشتے اور فرشتوں کی ہر صنف کا علم صرف اسی شعبے تک محدود ہے جس سے اس کا تعلق ہے۔ مثلاً ہوا کے انتظام سے بوجہ متعلق ہیں وہ ہوا کے تعلق سب کچھ جانتے ہیں مگر پانی کے متعلق کچھ نہیں جانتے یہی حال دوسرے محکموں کے فرشتوں کا ہے! انسان کو ان کے برعکس جامع علم دیا گیا ہے۔ ایک ایک شعبہ کے متعلق چاہے وہ اس شعبہ کے فرشتوں سے کم جانتا ہو، مگر مجموعی حیثیت سے جو جامعیت انسان کے علم کو بخشی گئی ہے وہ فرشتوں کو بے سہرا نہیں ہے۔

بتا دیے تو اللہ نے فرمایا ”میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی وہ ساری حقیقتیں جانتا ہوں جو تم سے مخفی ہیں، جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو وہ بھی مجھے معلوم ہے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو اُسے بھی میں جانتا ہوں!“

پھر جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے آگے بھٹک جاؤ تو سب جھک گئے، مگر ابلیس نے

اسے یہ مظاہرہ کر کے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے پہلے شبہ کو رفع فرما دیا۔ گویا اس طریقہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں بتایا کہ میں اسے صرف اختیارات ہی نہیں دے رہا ہوں بلکہ علم بھی دے رہا ہوں، اس کے تقرر سے فساد کا جو اندیشہ تھیں ہوا وہ اس معاملہ کا صرف ایک پہلو ہے، دوسرا پہلو صلاح کا بھی ہے اور وہ اس سے زیادہ ذہنی، زیادہ پیش قیمت ہے حکیم کا یہ کام نہیں ہے کہ چھوٹی خرابی کی وجہ سے بڑی بہتری کو نظر انداز کرے۔

اسے یعنی زمین اور اس سے تعلق رکھنے والے طبقہ کائنات میں جس قدر فرشتے مامور ہیں ان سب کو انسان کے لیے مطیع و مخرم ہو جانے کا حکم دیا گیا چونکہ اس علاقہ میں اللہ کے حکم سے انسان خلیفہ بنایا جا رہا تھا، اس لیے فرمان جاری ہوا کہ صحیح یا غلط جس کام میں بھی انسان اپنے اُن اختیارات کو استعمال کرنا چاہے جو ہم نے اُسے عطا کیے ہیں، اور ہم اپنی مشیت کے تحت اسے ایسا کر لینے کا موقع دے دیں، تو تمہارا فرض ہے کہ تم میں سے جس جس کے دائرہ عمل سے وہ کام متعلق ہو وہ اپنے دائرے کی حد تک اس کا ساتھ دے۔ وہ چوری کرنا چاہے یا نماز چھینا، نیکی کرنا چاہے یا بدی، دونوں صورتوں میں جب تک ہم اسے اسکی پسند کے مطابق عمل کرنے کا اذن دے رہے ہیں، تمہیں اس کے لیے سازگاری کرنی ہوگی۔ مثال کے طور پر اس کو یوں سمجھو کہ ایک فرمانروا جب کسی شخص کو اپنے ملک کے کسی حصہ کا حاکم مقرر کرتا ہے تو اس حصہ میں حکومت کے جس قدر کارندے ہوتے ہیں ان سب کا فرض ہوتا ہے کہ اس کی اطاعت کریں، اور جب تک فرمانروا کا مشاہدہ ہے کہ اسے اپنے اختیارات کے استعمال کا موقع دے اس وقت تک اُس کا ساتھ دیتے رہیں قطع نظر اس سے کہ وہ صحیح کام میں ان اختیارات کو استعمال کر رہا ہے یا غلط کام میں۔ البتہ جب جس کام کے بارے میں بھی فرماں روا کا اشارہ ہو جائے کہ اسے نہ کرنے دیا جائے تو وہیں ان حاکم صاحب کا اقتدار ختم ہو جاتا ہے اور انہیں ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ سارے علاقہ کے اہل کاروں نے گویا ہڑتال کر دی ہے جتنی کہ جس وقت فرمانروا کی طرف سے ان حاکم صاحب کی مخرولی اور گرفتاری کا حکم ہوتا ہے تو وہی ماتحت خدام جو کل تک ان کے اشاروں پر حرکت کر رہے تھے ان کے ہاتھوں میں (باقی صفحہ ۳۵ پر)

انکار کیا، اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں پڑ گیا اور نافرمانوں میں شامل ہو گیا۔

پھر ہم نے آدم سے کہا کہ تم اور تمہاری بیوی، دونوں جنت میں رہو اور یہاں بفرانت جو چاہو کھاؤ، مگر اس درخت کا رخ نہ کرنا ورنہ ظالموں میں شمار ہو گے۔ آخر کار شیطان نے ان دونوں کو

بقیہ صفحہ ۳۴) ہتھکڑیاں ڈال کر انہیں کشاں کشاں دارالفاسقین کا لٹ بجاتے ہیں۔ فرشتوں کو آدم کے لیے مسجود ہو جانے کا جو حکم دیا گیا تھا اس کی نوعیت کچھ اسی قسم کی تھی۔ ممکن ہے کہ صرف مسخر ہو جانے ہی کو بجدہ سے تعبیر کیا گیا ہو، مگر یہ بھی ممکن ہے کہ اس انقیاد کی علامت کے طور پر کسی ظاہری فعل کا بھی حکم دیا گیا ہو، اور یہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

۳۵ ابلیس۔ لفظی ترجمہ "اہتائی یا یوس"۔ اصطلاحاً یہ اس جن کا نام ہے جس نے اللہ کے حکم کی نافرمانی کر کے آدم اور بنی آدم کے لیے مطیع و مسخر ہونے سے انکار کر دیا اور اللہ سے قیامت تک کے لیے ہمدت مانگی کہ اسے نسل انسانی کو بہکانے اور گمراہیوں کی طرف ترغیب دینے کا موقع دیا جائے۔ اسی کو شیطان بھی کہا جاتا ہے اور جہاں کوئی قرینہ ایسا نہ ہو کہ انسان مراد لیا جاسکے وہاں لفظ شیطان سے یہی ابلیس مراد ہوتا ہے۔ حقیقت ابلیس بھی محض کسی مجرد قوت کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ایک صاحب تشخص مستی ہے جس طرح ہر انسان ایک صاحب تشخص مستی ہوتا ہے۔ نیز کسی کو یہ غلط فہمی بھی نہ ہونی چاہیے کہ یہ فرشتوں میں سے تھا۔ آگے چل کر قرآن نے خود تصریح کر دی ہے کہ وہ جنوں میں سے تھا جو فرشتوں سے الگ، مخلوقات کی ایک مستقل صنف ہیں۔

(حاشی صفحہ ۳۴) ۳۵ ان الفاظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالباً ابلیس بجدے سے انکار کرنے میں اکیلا نہ تھا بلکہ جنوں کی ایک جماعت نافرمانی پر آمادہ ہو گئی تھی اور ابلیس کا نام صرف اس لیے لیا گیا ہے کہ وہ ان کا سردار اور اس بغاوت میں پیش پیش تھا۔ لیکن اسی آیت کا دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کافروں میں سے تھا۔ اس صورت میں مطلب یہ ہو گا کہ جنوں کی ایک جماعت پہلے سے ایسی موجود تھی جو سرکش و نافرمان تھی، اور ابلیس کا تعلق اسی جماعت سے تھا۔ قرآن میں بالعموم شیاطین کا لفظ انہی جنوں اور ان کی ذریت (نسل) کے لیے استعمال ہوا ہے، اور جہاں شیاطین سے مراد انسان مراد لینے کے لیے کوئی قرینہ نہ ہو وہاں یہی مراد ہوتے ہیں۔

۳۵ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین، یعنی اپنی جائے تقرر پر خلیفہ کی حیثیت سے بھیجے جانے سے پہلے ان دونوں کو امتحان کی غرض سے جنت میں رکھا گیا تھا تاکہ ان کے رجحانات کی آزمائش (باقی صفحہ ۳۶ پر)

اس درخت کی ترغیب دے کر ہمارے حکم کی پیروی سے ہٹا دیا اور انہیں اس حالت سے نکلوا کر چھوڑا جس میں وہ تھے۔ ہم نے حکم دیا کہ اب تم سب یہاں سے اتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے

(بقیہ صفحہ ۳۵) ہو جائے۔ اس آزمائش کے لیے ایک درخت کو چن لیا گیا اور حکم دیا گیا کہ اس کے قریب نہ پھسکنا، اور اس کا انجام بھی بتا دیا گیا کہ ایسا کر گئے تو ہماری نگاہ میں ظالم قرار پاؤ گے۔ یہ بحث غیر ضروری ہے کہ وہ درخت کونسا تھا اور اس میں کیا خاص بات تھی کہ اس سے منع کیا گیا۔ منع کرنے کی وجہ یہ نہ تھی کہ اس درخت کی خاصیت میں کوئی خرابی تھی اور اس سے آدم و حوا کو نقصان پہنچنے کا خطرہ تھا۔ اصل غرض اس چیز کی آزمائش تھی کہ شیطان کی ترغیبات کے مقابلہ میں کس حد تک حکم کی پیروی پر قائم رہتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے کسی ایک چیز کا منتخب کر لینا کافی تھا۔ اسی لیے اللہ نے درخت کے نام اور اس کی خاصیت کا کوئی ذکر نہیں فرمایا۔

اس امتحان کے لیے جنت ہی کا مقام سب سے زیادہ موزوں تھا۔ دراصل اسے امتحان گاہ بنانے کا مقصد یہ حقیقت انسان کے ذہن نشین کرنا تھا کہ تمہارے لیے تمہارے مرتبہ انسانیت کے لحاظ سے جنت ہی لائق و مناسب مقام ہے۔ لیکن شیطانی ترغیبات کے مقابلہ میں اگر تم اللہ کی فرماں برداری کے راستے سے منحرف ہو جاؤ گے تو جس طرح ابتدا میں اس سے محروم کیے گئے تھے اسی طرح آخر میں بھی محروم ہی رہو گے۔ اپنے اس مقام لائق کی اپنی اس فردوس گم گشتہ کی بازیافت تم صرف اس طرح کر سکتے ہو کہ اپنے اُس دشمن کا کامیابی سے مقابلہ کرو جو تمہیں فرمانبردار کے راستے سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے۔

۳۵ ظالم کا لفظ نہایت معنی خیز ہے۔ ظلم دراصل حق تلفی کو کہتے ہیں۔ ظالم وہ ہے جو کسی کا حق تلف کرے جو شخص خدا کی نافرمانی کرتا ہے وہ درحقیقت تین بڑے بنیادی حقوق تلف کرتا ہے، اولاً خدا کا حق کیونکہ وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کی فرماں برداری کی جائے، ثانیاً ان تمام چیزوں کے حقوق جن کو اس نے اس نافرمانی کے ارتکاب میں استعمال کیا۔ اس کے اعضاء جسمانی، اس کے قولے نفس، اس کے ہم معاشرت انسان، وہ فرشتے جو اس کے ارادے کی تکمیل کا انتظام کرتے ہیں، اور وہ اشیاء جو اس کام میں استعمال ہوتی ہیں ان سب کا اس پر یہ حق تھا کہ وہ صرف ان کے مالک ہی کی مرضی کے مطابق ان پر اپنے اختیارات استعمال کرے، مگر جب اس کی مرضی کے خلاف اس نے ان پر اختیار

(باقی صفحہ ۳۷ پر)

دشمن ہو اور تمہیں ایک خاص وقت تک زمین میں ٹھہرنا اور وہیں گذر بسر کرنا ہے۔ اس وقت آدم نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ کر توبہ کی، جس کو اس کے رب نے قبول کر لیا کیونکہ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

(بقیہ صفحہ ۳۶) استعمال کیے تو درحقیقت ان پر ظلم کیا۔ ثنائاً خود اپنا حق، کیونکہ اس پر اس کی ذات کا یہ حق ہے کہ وہ اسے تباہی سے بچائے، مگر نافرمانی کر کے جب وہ اپنے آپ کو اللہ کی سزا کا متحمل بناتا ہے تو دراصل اپنی ذات پر ظلم کرتا ہے۔ انہی وجوہ سے قرآن میں جگہ جگہ گناہ کے لیے ظلم اور گناہ گار کے لیے ظالم کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ (حواشی صفحہ ۱۷) یعنی انسان کا دشمن شیطان اور شیطان کا دشمن انسان۔ شیطان کا دشمن انسان ہونا تو ظاہر ہے کہ وہ اسے اللہ کی فرماں برداری کے راستے سے ہٹانے اور تباہی میں ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ رہا انسان کا دشمن شیطان ہونا، توفی الواقع انسانیت تو اس سے دشمنی ہی کی مقتضی ہے مگر خواہشات نفس کے لیے جو تفریقاً پیش کرتا ہے ان سے دھوکا کھا کر آدمی اسے اپنا دوست بنا لیتا ہے۔ اس طرح کی دوستی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ حقیقتاً دشمنی دوستی میں تبدیل ہو گئی بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک دشمن دوسرے دشمن سے شکست کھا گیا اور اس کے جاں میں بھنس گیا۔

۱۷ یعنی آدم کو جب اپنے قصور کا احساس ہوا اور انھوں نے نافرمانی سے پھر فرماں برداری کی طرف رجوع کرنا چاہا، اور ان کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اپنے رب سے اپنی خطا معاف کرائیں تو انھیں وہ الفاظ نہ ملتے تھے جن کے ساتھ وہ خطا بخشی کے لیے دعا کر سکتے۔ اللہ نے ان کے حال پر رحم فرما کر وہ الفاظ بتا دیے۔ توبہ کے اصل معنی رجوع کرنے اور پلٹنے کے ہیں۔ بندہ کی طرف سے توبہ کے معنی یہ ہیں کہ وہ سرکشی سے باز آگیا، طریق بندگی کی طرف پلٹ آیا۔ اور خدا کی طرف سے توبہ کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے شرمسار غلام کی طرف رحمت کے ساتھ متوجہ ہو گیا، پھر سے نظر عنایت اس کی طرف مائل ہو گئی۔

۱۸ قرآن اس نظریہ کی تردید کرتا ہے کہ گناہ کے نتائج لازمی ہیں اور وہ بہر حال انسان کو بھگتنے ہی ہوں گے۔ یہ انسان کے اپنے خود ساختہ گمراہ کن نظریات میں سے ایک بڑا گمراہ کن نظریہ ہے، کیونکہ جو شخص ایک مرتبہ گناہ گار بنا زندگی میں مبتلا ہو گیا اس کو یہ نظریہ ہمیشہ کے لیے مایوس کر دیتا ہے اور اگر اپنی غلطی پر متنبہ (باقی صفحہ ۳۸ پر)

ہم نے کہا کہ تم سب یہاں سے اتر جاؤ، پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس پہنچے، تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا اندیشہ

(بقیہ صفحہ ۳۷) ہونے کے بعد وہ سابق کی تلافی اور آئندہ کے لیے اصلاح کرنا چاہے تو یہ اس سے کہتا ہے کہ تیرے بچنے کی اب کوئی امید نہیں، جو کچھ تو کر چکا ہے اس کے نتائج بہر حال تیری جان کے لاگو ہی رہیں گے۔ قرآن اس کے برعکس یہ بتاتا ہے کہ بھلائی کی جزا اور برائی کی سزا دینا بالکل اللہ کے اختیار میں ہے۔ تمہیں جس بھلائی پر انعام ملتا ہے وہ تمہاری بھلائی کا طبعی نتیجہ نہیں ہے بلکہ اللہ کا فضل ہے، چاہے عنایت فرمائے چاہے نہ فرمائے۔ اسی طرح جس برائی پر تمہیں سزا ملتی ہے وہ بھی برائی کا طبعی نتیجہ نہیں ہے کہ لازماً مترتب ہی ہو کر ہے، بلکہ اللہ پورا اختیار رکھتا ہے کہ چاہے معاف کرے اور چاہے سزا دیدے۔ البتہ اللہ کا فضل اور اس کی رحمت، اس کی حکمت کے ساتھ ہمیشہ ہے۔ وہ چونکہ حکیم ہے اس لیے اپنے اختیارات کو اندھا دھند استعمال نہیں کرتا جب کسی بھلائی پر انعام دیتا ہے تو یہ دیکھ کر ایسا کرتا ہے کہ بندے نے سچی نیت کے ساتھ اس کی رضا کے لیے بھلائی کی تھی، اور جس بھلائی کو رد کر دیتا ہے اسے اس بنا پر رد کرتا ہے کہ اس کی ظاہری شکل بھلے کام کی سی تھی مگر اندر اپنے رب کی رضا جوئی کا خالص جذبہ نہ تھا۔ اسی طرح وہ سزاں قصور پر دیتا ہے جو باغیانہ جسارت کے ساتھ کیا جائے اور جس کے پیچھے شرمساری کے بجائے مزید ارتکاب جرم کی خواہش موجود ہو، اور اپنی رحمت سے معافی اس قصور پر دیتا ہے جس کے بعد بندہ اپنے کیے پر شرمندہ اور آئندہ کے لیے اپنی اصلاح پر آمادہ ہو۔ بڑے مجرم، کتے سے کتے کافر کے لیے بھی خدا کے ہاں یا بوسی و ناامیدی کا کوئی موقع نہیں بشرطیکہ وہ اپنی غلطی کا معترف، اپنی نافرمانی پر نادم، اور بغاوت کی روش چھوڑ کر اطاعت کی روش اختیار کرنے کے لیے تیار ہو۔

(حاشیہ صفحہ ۳۷) اس فقرہ کا دوبارہ اعادہ معنی خیز ہے۔ اوپر کے فقرے میں یہ بتایا گیا ہے کہ آدم نے توبہ کی اور اللہ نے قبول کر لی۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ آدم اپنی اس نافرمانی پر عذاب کے مستحق نہ رہے، گناہ گاری کا جو داغ ان کے دامن پر لگ گیا تھا وہ دھو ڈالا گیا، نہ یہ داغ ان کے دامن پر رہا نہ ان کی نسل کے دامن پر اور نہ اس کی ضرورت پیش آئی کہ معاذ اللہ خدا کو اپنا اکلوتا بیٹے کو نوح انسانی کا کفارہ ادا کرنے کے لیے سولی پر چڑھوانا پڑتا، برعکس اس کے اللہ نے آدم علیہ السلام کی توبہ ہی قبول کرنے پر اکتفا نہ فرمایا بلکہ اس کے بعد (باقی حاشیہ صفحہ ۳۷)

نہ ہوگا، اور جو اس کو قبول کرنے سے انکار کرے گا اور ہماری آیات کو جھٹلائے گا وہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔“

(بقیہ صفحہ ۳۸) انھیں نبوت سے بھی سرفراز کیا تاکہ وہ اپنی نسل کو یہاں رہا رہتا رہتا کر جائیں۔ اب جو جنت سے نکلنے کا حکم پھر دہرایا گیا تو اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ قبول توبہ کا یہ مقصد ہی نہیں تھا کہ آدم کو جنت ہی میں رہنے دیا جاتا اور زمین پر نہ اتارا جاتا۔ زمین ان کے لیے دارالغذاب نہ تھی، وہ یہاں سزا کے طور پر نہیں اتارے گئے، بلکہ انھیں زمین کی خلافت ہی کے لیے پیدا کیا گیا تھا۔ جنت ان کی پہلی جائے قیام نہ تھی۔ وہاں سے نکلنے کا حکم ان کے لیے سزا کی حیثیت نہ رکھتا تھا۔ اصل تجویز تو ان کو زمین ہی پر اتارنے کی تھی، البتہ اس سے پہلے ان کو اس امتحان کی غرض سے جنت میں رکھا گیا تھا جس کا ذکر اوپر ایک حاشیہ میں کیا جا چکا ہے۔

جو وہی عنقریب آیت جمع ہے آیت کی۔ آیت کے اصل معنی اس نشانی یا علامت کے ہیں جو کسی چیز کی طرف رہنمائی کرے۔ قرآن میں یہ لفظ چار مختلف معنوں میں آیا ہے۔ کہیں اس سے مراد محض علامت یا نشانی ہی ہے۔ کہیں آثار کائنات کو اللہ کی آیات کہا گیا ہے، کیونکہ مظاہر قدرت میں سے ہر چیز اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو اس ظاہری پردے کے پیچھے مستور ہے۔ کہیں ان معجزات کو آیات کہا گیا ہے جو انبیاء علیہم السلام لے کر آتے تھے، کیونکہ یہ معجزے دراصل اس بات کی علامت ہوتے تھے کہ یہ لوگ فرماں روائے کائنات کے نمائندے ہیں۔ کہیں کتاب اللہ کے فقرہوں کو آیات کہا گیا ہے، کیونکہ وہ نہ صرف حق اور صداقت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں بلکہ فی الحقیقت اللہ کی طرف سے جو کتاب بھی آتی ہے اس کے محض مضامین ہی میں نہیں، اس کے الفاظ اور انداز بیان اور طرز عبارت تک میں اس کے جلیل القدر مصنف کی شخصیت کے آثار نمایاں طور پر محسوس ہوتے ہیں۔ ہر جگہ عبارت کے سیاق و سباق سے باسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ کہاں ”آیت“ کا لفظ کس معنی میں آیا ہے۔

یہ نسل انسانی کے حق ہیں ابتداءً آفرینش سے قیامت تک کے لیے اللہ کا مستقل فرمان ہے اور اسی کو تیسرے رکوع میں اللہ کے ”عہد“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ انسان کا کام خود راہ راستہ تجویز کرنا نہیں ہے بلکہ بندہ اور خلیفہ ہونے کی دو گونہ حیثیتوں کے لحاظ سے وہ اس پر مامور ہے کہ اس راہ کی پیروی کرے جو اس کا رب اس کے لیے تجویز کرے۔ اور اس راہ کے معلوم ہونے کی دو ہی صورتیں ہیں، یا تو کسی انسان کے پاس براہ راست اللہ کی طرف سے وحی آئے یا پھر وہ اس انسان کا اتباع کرے جس کے پاس وحی آئی ہو۔ کوئی تیسری صورت یہ معلوم ہونے کی نہیں ہے کہ رب کی رضا کس راہ میں ہے۔ ان دو صورتوں کے ماسواہر صورت غلط ہے بلکہ غلط ہی نہیں عین بغاوت ہے جس کی سزا جہنم کے سوا اور کچھ نہیں۔